مرتا ہوں اُس آواز پہ ہر چند سر اُڑ جائے
جلّاد کو لیکن وہ کہے جائیں کہ ہاں اور
ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالبؔ کا ہے اندازِ بیاں اور

دوشنبے کا دن، بیس دسمبر کی، صبح کا وقت ہے۔ انگیٹھی رکھی ہوئی ہے۔ آگ تاپ رہا ہوں اور خط لکھ رہا ہوں۔ یہ اشعار یاد آگئے، تم کو لکھ بھیجے۔ والسلام

دوشنبہ ۲۰ دسمبر ۱۸۵۸ء ۲

(۱۴)

بھائی صاحب!

تمہارا خط اور قصیدہ پہنچا۔ اصل خط تمہارا لفافے میں لپیٹ کر مرزا تفتہ کو بھیج دیا تاکہ حال اُن کو مفصل معلوم ہو جائے۔ بعد اس رپوٹ کے تم کو تہنیت دیتا ہوں۔ پروردگار بہ تصدقِ ائمہ اطہار یہ پیش آمدِ اقبال تم کو مبارک کرے اور منصب ہائے خطیر اور مدارجِ عظیم کو پہنچاوے۔ واقعی یہ کہ تم نے بڑی جرأت کی، فی الحقیقت اپنی جان پر کھیلے تھے۔ بات پیدا کی مگر اپنی مردی و مردانگی سے۔ دولت کا ہاتھ آنا مع نیک نامی، اس سے بہتر دنیا میں کوئی بات نہیں۔ اب یقین ہے کہ خدمتِ منصفی ملے اور جلد ترقی کرو۔ ایسا کہ سالِ آیندہ تک چشم بددور صدر الصدور ہو جاؤ۔

اللہ اللہ ایک وہ زمانہ تھا کہ "مغل" نے تمہارا ذکر مجھ سے کیا تھا اور وہ اشعار جو تم نے اُس کے حُسن کے وصف میں لکھے تھے، تمہارے ہاتھ کے لکھے ہوئے مجھ کو دکھائے تھے۔ اب ایک یہ زمانہ ہے کہ طرفین سے نامہ و پیام آتے جاتے ہیں۔ اِنشاءَ اللہ تعالیٰ وہ دن بھی آ جائے گا کہ ہم تم باہم بیٹھیں اور باتیں کریں۔ قلم بیکار ہو جائے، زبان بر سرِ گفتار آئے۔

انشاء اللہ خاں کا بھی قصیدہ میں نے دیکھا ہے۔ تم نے بہت بڑھ کر لکھا ہے اور اچھا

سماں باندھا ہے۔ زبان پاکیزہ، مضامین اچھوتے، معانی نازک، مطالب کا بیان دل نشیں۔ زیادہ کیا لکھوں۔

اپریل ۱۸۵۹ء ۲ غالب

(۱۵)

شرطِ اسلام بود ورزشِ ایمان بالغیب
اے تو غائب زنظر، مہرِ تو ایمانِ من است

حلیۂ مبارک نظر افروز ہوا۔ جانتے ہو کہ مرزا یوسف علی خاں عزیز نے جو کچھ تم سے کہا، اُس کا منشا کیا ہے؟ کبھی میں نے بزمِ احباب میں کہا ہوگا کہ مرزا حاتم علی کے دیکھنے کو جی چاہتا ہے۔ سنتا ہوں کہ وہ طرح دار آدمی ہیں اور بھائی تمہاری طرح داری کا ذکر میں نے مغل جان سے سنا تھا۔ جس زمانے میں کہ وہ نواب حامد علی خاں کی نوکر تھی اور اُس میں مجھ میں بے تکلفانہ ربط تھا تو اکثر مغل سے پہروں اختلاط ہوا کرتے تھے۔ اُس نے تمہارے شعر اپنی تعریف کے بھی مجھ کو دکھائے ہیں۔

بہ ہر حال، تمہارا حلیہ دیکھ کر تمہارے کشیدہ قامت ہونے پر مجھ کو رشک نہ آیا۔ کس واسطے، میرا قد بھی درازی میں انگشت نما ہے۔ تمہارے گندمی رنگ پر رشک نہ آیا۔ کس واسطے کہ جب میں جیتا تھا تو میرا رنگ چمپئی تھا اور دیدہ ور لوگ اُس کی ستایش کیا کرتے تھے۔ اب جو کبھی مجھ کو وہ اپنا رنگ یاد آتا ہے تو چھاتی پر سانپ سا پھر جاتا ہے، ہاں مجھ کو رشک آیا اور میں نے خونِ جگر کھایا تو اس بات پر کہ ڈاڑھی خوب گھٹی ہوئی ہے۔ وہ مزے یاد آگئے کیا کہوں جی پر کیا گزری۔ بہ قولِ شیخ علی حزیںؔ:

تا دسترسم بود، زدم چاک گریباں
شرمندگی از خرقۂ پشمینہ ندارم

جب ڈاڑھی مونچھ میں سفید بال آگئے، تیسرے دن چیونٹی کے انڈے گالوں پر

نظر آنے لگے۔ اس سے بڑھ کر یہ ہوا کہ آگے کے دو دانت ٹوٹ گئے۔ ناچار مِسّی بھی چھوڑ دی اور ڈاڑھی بھی مگر یہ یاد رکھیے کہ اس بھونڈے شہر میں ایک وردی ہے عام۔ ملّا، حافظ، بساطی، نیچہ بند، دھوبی، سقّا، بھٹیارہ، جولاہا، کنجڑہ، منہ پر ڈاڑھی سر پر بال۔ فقیر نے جس دن ڈاڑھی رکھی، اُسی دن سر منڈایا۔ لَاحَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِیِّ الْعَظِیْمِ کیا بک رہا ہوں۔

صاحب! بندے نے "دستنبو" جناب اشرف الامرا جارج فریڈرک ایڈمنسٹن[2] صاحب لفٹنٹ گورنر بہادر غرب و شمال کی نذر بھیجی تھی۔ سو اُن کا فارسی خط محررۂ دہم مارچ مشتمل بر تحسین و آفرین و اظہارِ خوشنودی بطریقِ ڈاک آگیا۔ پھر میں نے تہنیت میں لفٹنٹ گورنری کے قصیدہ فارسی بھیجا۔ اُس کی رسید میں نظم کی تعریف اور اپنی رضامندی پر متضمن خط فارسی بہ سبیلِ ڈاک مرقومہ چہار دہم آگیا۔ پھر ایک قصیدہ فارسی مدح و تہنیت میں جناب رابرٹ منٹگمری صاحب لفٹنٹ گورنر بہادر پنجاب کی خدمت میں بہ واسطۂ صاحب کمشنر بہادر دہلی بھیجا تھا۔ کل اُن کا مہری خط بہ ذریعۂ صاحب بہادر دہلی آگیا۔ پنسن کے باب میں ابھی کچھ حکم نہیں۔ اسباب توقع کے فراہم ہوتے جاتے ہیں۔ دیر آید درست آید۔ اناج کھاتا ہی نہیں ہوں۔ آدھ سیر گوشت دن کو اور پاؤ بھر شراب رات کو مل جاتی ہے:

ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ تو کیا ہے
تمھیں کہو کہ یہ اندازِ گفتگو کیا ہے

اگر ہم فقیر سچے ہیں اور اس غزل کے طالب کا ذوق پکا ہے تو یہ غزل اس خط سے پہلے پہنچ گئی ہوگی۔ رہا سلام، وہ آپ[3] پہنچا دیں گے۔

اواخر اپریل ۱۸۵۹ء[4]

(۱۶)

جناب مرزا صاحب!

دلّی کا حال تو یہ ہے، شعر:

گھر میں تھا کیا جو ترا غم اُسے غارت کرتا
وہ جو رکھتے تھے ہم اک حسرتِ تعمیر، سو ہے[1]

یہاں دھرا کیا ہے جو کوئی لُوٹے گا۔ وہ[2] خبر محض غلط ہے اگر کچھ ہے تو یہ ہے نمط ہے کہ چند روز چند گوروں نے اہلِ بازار کو ستایا تھا۔ اہلِ قلم اور اہلِ فوج نے بہ اتفاق رائے[3] ہم دگر ایسا بندوبست کیا کہ وہ فساد مٹ گیا۔ اب امن و امان ہے۔

ناسخ مرحوم جو تمھارے اُستاد تھے، میرے بھی دوست صادق الوداد تھے، مگر یک فنے تھے۔ صرف غزل کہتے تھے۔ قصیدے اور مثنوی سے اُن کو کچھ علاقہ نہ تھا۔ سُبحانَ اللہ تم نے قصیدے میں وہ رنگ دکھایا کہ انشا کو رشک آیا۔ مثنوی کے اشعار جو میں نے دیکھے، کیا کہوں کیا حظ اٹھایا۔

بیت:

خدا سے میں بھی چاہوں از رہِ مہر
"فروغِ میرزا حاتم علی مہر"

اگر اسی انداز پر انجام پائے گی تو یہ مثنوی کارنامۂ اُردو کہلائے گی۔ خدا تم کو جیتا رکھے۔ تمھارا دم غنیمت ہے۔ صاحب! میں تم سے پوچھتا ہوں کہ "معیار الشعرا" میں تم نے اپنا خط کیوں چھپوایا؟ تمھارے ہاتھ کیا آیا؟ سنو تو سہی اگر سب کا کلام اچھا ہو تو امتیاز کیا رہے؟

اپریل ۱۸۵۹ء ۶

(۱۷)

مرزا صاحب!

ہم کو یہ باتیں پسند نہیں۔ پینسٹھ برس کی عمر ہے۔ پچاس برس عالمِ رنگ و بو کی سیر کی ہے۔ ابتدائے شباب میں ایک مرشدِ کامل نے یہ نصیحت کی ہے کہ ہم کو زہد و ورع منظور نہیں۔ ہم مانعِ فسق و فجور نہیں۔ پیو، کھاؤ، مزے اُڑاؤ مگر یہ یاد رہے کہ مصری کی مکھی بنو۔ شہد کی مکھی نہ بنو۔ سو، میرا اس نصیحت پر عمل رہا ہے، کسی کے مرنے کا وہ غم کرے جو آپ نہ مرے۔ کیسی اشک